عبادت اور طریق عبادت

آیۃ اللہ العظمیٰ سیّد العلماء سیّد علی نقی نقوی طاب ثراہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا ایّھا النّاس اعبدوا ربّکم الّذی خلقکم والّذی من قبلکم لعلّکم تتّقون۔

اے انسانو! عبادت کرو اس کی جس نے تم کو پیدا کیا اور انھیں جو تمہارے پہلے تھے تاکہ تم میں تقویٰ کا جوہر پیدا ہوجائے۔

عام طور سے لوگ اسلام اور غیر اسلام کا امتیاز طریق عبادت کی بنا پر سمجھتے ہیں مگر حقیقتاً اسلامی نقطۂ نظر سے طریق عبادت کو بنیادی حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ مرکز عبادت یعنی معبود کو۔ پہلا سوال یہ نہیں ہے کہ عبادت کیوں کر ہو بلکہ پہلا سوال یہ ہے کہ عبادت کس کی ہو۔

مذہب میں دو چیزیں ہیں: دین و شریعت۔ دین وہ حقیقتیں جنھیں ماننا لازم ہے اور شریعت وہ احکام جن پر عمل ضروری ہے۔ دین آدم سے لے کر خاتم تک ایک رہا ہے اور شریعتیں بدلتی رہیں ہیں۔ اسی کو اصول اور فروع کے اصطلاحی ناموں سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مذکورہ سابق دونوں چیزوں میں طریق عبادت تو فروع میں داخل ہے یعنی شریعت کا جز ہے اور معبود کی تعیین اصول میں داخل ہے یعنی جزو دین ہے۔

صحیح طریق عبادت مثلاً سجدہ وہ بھی غلط معبود کے لئے ہو تو منافیٔ اسلام ہے اور غلط طریق عبادت فرض کر لیجئے۔ ڈنڈوت بھی معبود حقیقی کے لئے ہو تو چاہے وہ غلط ہو مگر اسلام سے خارج کرنے کا سبب نہ ہوگی۔

غالبؔ بہت اچھا شاعر ہے اس کا یہ شعر بہت مقبول ہے مگر شعر کا بحیثیت شعر عمدہ ہونا اور چیز ہے اور اس کا مطابق حقیقت ہونا اور چیز ہے۔ شعر یہ ہے ؎

وفاداری بشرط استواری عین ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

حالانکہ اس شعر کے بحیثیت شعر عمدہ ہونے میں بھی کلام کی گنجائش ہے۔ کوئی شاعر بہت اچھا ہو، تو کیا ضروری ہے کہ اس کا ہر شعر اچھا ہی ہے مگر مجھے اس کے اچھے اور برے ہونے سے کوئی بحث نہیں ہے۔ ہاں وہ غلط یقینا ہے۔ وفاداری بشرط استواری عین ایماں ہے یا نہیں؟ اس میں ایک ضروری کڑی دیکھنا لازم ہے اور وہ یہ کہ وفاداری کس سے؟

اگر جائز حکومت اور صحیح مرکز اقتدار سے وفاداری ہو تو یہ وفاداری بے شک عین ایماں ہے لیکن اگر وفاداری غلط مرکز کے ساتھ نباہی جارہی ہو تو غداروں اور رہزنوں کے ساتھ وفاداری کی جارہی ہو، تو وہ قابل تعریف کہاں ہوسکتی ہے۔ ان سے تو بغاوت عین فریضۂ انسانی ہوگی۔ ان سے وفاداری عین ایمان ہرگز نہیں ہوسکتی۔

چونکہ طریقۂ عبادت کا تعلق شریعت سے ہے اور مرکز عبادت کا تعلق دین سے ہے، اس لئے جہاں جہاں قرآن میں طریقۂ عبادت کی تعلیم دی گئی ہے عموماً خطاب **"یا ایھا الذین آمنوا"** کی لفظ سے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں مخاطب کیا جا رہا ہے جو مرکز عبادت کو صحیح طور پر مان چکے یعنی دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے۔ اب اسلام لائے ہیں تو انھیں سکھانے کی ضرورت ہے کہ عبادت کس طرح کریں۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ نماز

پڑھیں۔نماز جب پڑھنا چاہیں،تو پہلے وضو کریں اور اس طرح غسل کریں اور اس صورت سے کریں روزے رکھیں اور ماہ رمضان میں رکھیں۔اگر بیمار ہوں یا سفر میں ہوں تو کسی اور زمانہ میں قضا کریں۔ان سب احکام کا سرنامہ اہل ایمان سے خطاب ہے۔**ان الصلوۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً۔یاایھا الذین آمنوا اذا قمتم الیٰ الصلوۃ فاغسلوا وجھکم و ایدیکم الی المرافق (تا آخر آیت) یاایھاالذین آمنوا کتب علیکم الصیام** وغیرہ وغیرہ۔

مگر یہ کہ کس کی عبادت کرو، اسے جب بتایا جاتا ہے تو خطاب کیا جاتا ہے "یاایھاالناس" (اے انسانو)، کیونکہ یہ تو وہ پیغام ہیں جسے مان کر ہی وہ مسلمان ہوں گے۔ اس کے تسلیم کرنے ہی سے وہ "الذین آمنوا" کے مصداق بنیں گے۔ عبادت کا پیغام تو حقیقت میں خود اسلام و ایمان کا پیغام ہے جس میں مخاطب تمام نوع انسانی کو بنایا جارہا ہے۔اب جو اس پیغام کو مانیں گے، وہ مسلم قرار پائیں گے اور جو نہ مانیں گے وہ کافر قرار پائیں گے۔ **یا ایّھا النّاس اعبدوا ربّکم الّذی خلقکم و الّذی من قبلکم**۔ یہاں معبود کے لئے یہ الفاظ کہے جارہے ہیں کہ اس کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور انھیں بھی پیدا کیا ہے جو تمہارے پہلے تھے۔اس میں ضمناً یہ بات کہی جا رہی ہے کہ ان کی عبادت نہ کرو جن کے خالق تم خود ہو یعنی اصنام اور نہ اپنے بزرگوں میں سے کسی کی عبادت کرو جو تمہارے پہلے تھے۔ یہ اسلاف کی عبادت پر تازیانہ ہے۔ جہاں تک غور کیا جاتا ہے خود عبادت اصنام عبادت اسلاف ہی کے تصور سے پیدا ہوئی ہے تو اگر مرکز عبادت ان اصنام کو سمجھو تو یہ خود تمہارے پیدا کئے ہوئے ہیں اور اگر ان اسلاف کو مرکز عبادت سمجھو جن کی یہ مورتیاں ہیں تو یہ اسلاف خود اللہ کے پیدا کئے ہوئے تھے۔ لہٰذا وہ دونوں ہی عبادت کے لائق نہیں ہیں عبادت کے لائق وہ ذات ہے جو سب کی خالق ہے اور وہ وہی ہوگی جو کسی کی مخلوق نہ ہو۔غور کیا جائے تو یہی خالق کے تمام صفات کے تصور کا سرچشمہ ہے۔جو حادث ہوگا ممکن ہوگا، فنا پذیر ہوگا، وہ مخلوق ضرور ہوگا لہٰذا اصل خالق جس کی عبادت کرنا چاہئے وہ ہے واجب الوجود ہو یعنی جس کی ہستی میں نیستی کا گذر نہ ہو، بس اس کی عبادت درست ہے، اس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں ہے۔

عبادت اور تعظیم میں فرق

اسلاف اگر مذہبی حیثیت سے کسی عزت و احترام کے مستحق ہیں تو ان کی تعظیم و تکریم بے شک درست ہے مگر اس احساس کے ساتھ کہ ان کی عظمت اور بزرگی جو کچھ ہے وہ منجانب اللہ ہے اور اس کی اطاعت وعبودیت کی بنا پر ہے۔اس احساس کے ساتھ تعظیم ہوگی تو وہ تعظیم تو ہوگی ان اسلاف کی اور عبادت ہوگی پروردگار عالم کی جس نے انہیں خلق کیا ہے۔

بے شک اگر خود انہیں کو خدا یا مظہر خدا سمجھ کر معبود بنا لیا ہے، چاہے ان کے علاوہ کوئی اللہ کا تصور ہو بھی مگر انسان مرکز عبادت انہیں کو بنا رہا ہے تو یہ شرک ہوگا جیسا کہ مشرکین کہتے تھے:- یا ے

مانعبدھم الا لیقربونا الیٰ اللہ زلفیٰ

"ہم ان کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے تقرب کا باعث ہوں گے۔"

یہاں اللہ کا نام تو لیا جاتا تھا مگر متعلق عبادت وہ انہیں اصنام کو قرار دیتے تھے لیکن کسی مسلمان سے خواہ وہ روضۂ رسول کا بوسہ دے اور خواہ کسی امام کی آستاں بوسی کرے اور چاہے ان کی جانب منسوب شدہ شعار کا احترام کرے۔اس سے پوچھا جائے کہ تم روضہ یا اس شبیہ کی عبادت کیوں کرتے ہو تو وہ کہے گا کہ ہم ان کی عبادت نہیں کرتے بلکہ تعظیم و احترام کرتے ہیں۔ اس صورت میں اسے شرک سمجھنا بے بنیاد ہے۔

عبادت، عبادت اس وقت تک ہے ہی نہیں جب تک قصد عبادت نہ ہو لیکن عامل تو اپنے عمل میں پکار کر کہتا ہے کہ میں عبادت نہیں کرتا اور آپ اس کی نسبت فیصلہ صادر کریں کہ یہ غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے تو یہ بے بنیاد الزام سے زیادہ کوئی حیثیت

نہیں رکھتا۔ تعظیم تو بیٹا باپ کی کرتا ہے، شاگرد استاد کی کرتا ہے، نوکر اپنے ولی نعمت کی کرتا ہے اور اس کا کیا ذکر ہر مومن کو دوسرے مومن کی اور ہر انسان کو دوسرے انسان کی تعظیم کرنا چاہئے۔ اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بیٹی کی تعظیم فرماتے تھے۔ اگر اس تعظیم کے ساتھ یہ تصور شریک ہے کہ ہمیں اللہ نے اس کا حکم دیا ہے تو یہ تعظیم ہے مخلوق کی مگر عبادت ہے خالق کی۔ اگر یہ تصور ذہن میں نہیں بھی ہے بلکہ صرف ایک انسانی حق کا ادا کرنا مدنظر ہے تب بھی وہ امر مستحسن ہے۔ بے شک اگر حکم الٰہی سے سرتابی کرتے ہوئے اس شئے ہی کی عبادت کی نیت سے تعظیم کی جائے تو وہ شرک میں داخل ہوگا۔ مگر کوئی مسلمان، چاہے وہ خواص ہوں چاہے وہ عوام مگر ہرگز یہ نیت نہیں رکھتے اور اس کا ثبوت یہی ہے کہ کسی جاہل سے جاہل مسلمان سے بھی یہ کہہ دیجئے کہ تم کسی قبر کو پوجتے ہو یا تعزیہ کو پوجتے ہو تو وہ لڑنے کے لئے تیار ہوجائے گا۔ بس اس کا اسے برا ماننا ہی اس کے لئے کافی ہے کہ وہ اس شئے کی عبادت نہیں کرتا ہے۔ اب آپ منطق اور فلسفہ کی مدد سے اسے سمجھائیے کہ نہیں تمہارا یہ فعل عبادت ہی ہے اور وہ آپ کے دلائل کے مقابلہ میں لاجواب ہوجائے تو یہ آپ کی منطق کی اس کی جہالت پر فتح چاہے سمجھ لی جائے مگر اس سے اس کا فعل حقیقتاً عبادت نہیں قرار پائے گا، اور اس لئے شرک نہیں ہوگا کیونکہ عبادت کی نیت ہی حقیقت سے وابستہ ہے۔ عبادت تو ہے وہی جسے سمجھنے والا یہ سمجھ کر کرے کہ وہ عبادت کر رہا ہے نہ وہ کہ جسے آپ منطق سے ثابت کریں کہ یہ عبادت ہے۔

طریقہ کا تعین یا مرکز کا؟

طریق عبادت کا صرف بدلنا اگر اسلام کا نصب العین ہوتا تو وہ ایک جزئی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ تو بس ایک رسم کا بدلنا ہوا۔ اس کے لئے اتنی قربانیاں پیش نہ کی جاتیں جو کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں طرح طرح کے زحمات اور ایذاؤں کے برداشت کی صورت میں پیش کیں اور جن قربانیوں کا اپنے بعد کے لئے ذخیرہ چھوڑا۔

اسلام کا مقصد مرکز عبادت اور مقصد توجہ کو بدلنا تھا۔ یہ ذہنیت کی تبدیلی ہے اور ذہنیت کے ماتحت انسان کے سب افعال و اعمال ہوتے ہیں، چاہے وہ کسی بھی شعبۂ زندگی سے متعلق ہوں۔

یہ انسان کے نوعی شرافت کے تحفظ کا سوال تھا، اس لئے کہ جتنا معبود پست ہوگا اتنا ہی انسان پست تر ہوگا اور جتنی بلند نگاہی کے ساتھ معبود کا تصور ہوگا، اسی تناسب سے عبدیت کا درجہ بلند ہوگا اور انسان کے مرتبہ میں رفعت ہوگی۔ پھر جس قدر انسان کو اپنی نوعی رفعت کا احساس قوی ہوگا، اتنا ہی اس کا کردار اونچا ہوگا۔

اسلام نے جو یہ بتایا کہ کائنات میں کوئی شئے انسان کا معبود ہونے کے لائق نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خود انسان تمام کائنات سے برتر درجہ رکھتا ہے۔ پھر اسے اپنا معبود کسی مخلوق کو قرار دینا انسانی رفعت کو فراموش کرنا ہے، اس لئے کہ پہلی پست نظری یہ ہے کہ ان سونے چاندی یا پتھر کے بتوں کی پوجا کرے جو خود اس کے تراشے ہوئے ہیں اور پھر دوسری پست نظری یہ ہے کہ ایسوں کی پوجا کرے جو خود اس کے چاہے پیدا کئے ہوئے نہ ہوں مگر ہیں وہ بہرحال کسی نہ کسی کے مخلوق۔

اب اس میں اگرچہ براہ راست عبادت اسلاف ہی پہ زد پڑتی ہو اس لئے کہ کہا جا رہا ہے کہ اس کی پرستش کرو جس نے تمہارے قبل والوں کو بھی پیدا کیا ہے مگر جب ان کی عبادت کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ بھی مخلوق ہیں تو اب آفتاب، مہتاب ستارے اور دیگر اجرام سماویہ غرض غیر اللہ ہر ایک کی معبودیت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس لئے کہ جس طرح ہمارے اسلاف مخلوق ہیں، اس لئے معبود نہیں ہوسکتے، اسی طرح یہ تمام چیزیں بھی مخلوق ہی ہیں، اس لئے ان میں سے کوئی معبود بننے کے لائق نہیں ہے۔ اس طرح شرک کی جتنی صورتیں کبھی بھی رائج رہی ہیں ان سب کا خاتمہ ہوگیا اور معبود کے بارے میں اس بلند تصور سے انسان کی پوری زندگی اور پوری نوع کی سطح ذہنی و عملی میں وہ

بلندی آجاتی ہے جواس کے شایان شان ہے۔اور یہ وہ بلند مقصد تھا جوان تمام قربانیوں کی قیمت بن سکتا تھا جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کواس راہ میں پیش کرنا پڑیں۔

فروع میں اصول کا تحفظ

مرکز عبادت کا تصور دماغ سے متعلق ہے اور طریقۂ عبادت کا تعلق اعضاء وجوارح کے ساتھ ہے۔ مثلاً نماز اس میں اللہ اکبر سے لے کر سلام تک اذکار ہیں جن میں سورۂ حمد دوسرا سورہ، اور ذکر رکوع وسجود وغیرہ ہیں اور قیام تکبیر سے لے کر جلوس سلام تک افعال ہیں جن میں رکوع سجود وغیرہ ہیں ان اذکار اور افعال کا مجموعہ نماز ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے مرکز عبادت یعنی معبود کے تصور کا تعلق اصول دین سے ہے اور طریقۂ عبادت کا تعلق فروع دین سے ہے۔ مگر اسلام نے اپنے حکیمانہ نظام تشریع سے عبادات میں نیت کو ضروری قرار دے کر فروع میں اصول کے تحفظ کا سامان کیا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اذکار جو زبان پر برابر آتے رہتے ہیں اور اوراد جو حفظ ہو جائیں ان کا دماغ سے تعلق قطع ہو جاتا ہے بلکہ زبان عادی ہو جاتی ہے کہ ایک لفظ کے بعد بے ساختہ دوسری لفظ کو کہے اسی طرح افعال جن کی عادت پڑ جائے لاشعوری طور پر ہونے لگتے ہیں۔

اگر صرف طریقۂ عبادت کی تعلیم دی گئی ہوتی اور اس طریقہ پر نماز کی عادت ڈال دی جاتی تو امتداد زمانہ سے رفتہ رفتہ ہمیں احساس بھی نہ رہتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ جیسے مختلف قوموں کی رسمیں ہیں کہ ان قوموں کے افراد کو ان کے پس منظر کا کوئی احساس نہیں ہے کہ اصل میں بنیاد اس رسم کی کیا تھی؟

جیسے ہندوؤں میں ہولی اور دیوالی کی رسمیں، کتنے ہندو ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ یہ چراغ کیوں روشن ہوتے ہیں اور یہ آگ کس لئے لگائی جاتی ہے؟ اس طرح خود آپ کے یہاں مثلاً عید کی سویاں وغیرہ۔ پھر ایسی رسموں کو ان پر عمل کرنے والوں سے پوچھا جائے کہ کیوں ہیں؟ تو اس کا جواب صرف یہ ہے کہ یونہی ہوتا آیا ہے۔ یہی حال مذہبی عبادتوں کے طریقہ کا ہوتا ہے۔ ہم ان افعال کو کرتے رہتے ہیں اور پس پشت کوئی شعور نہ ہوتا جو کارفرما ہو۔ مگر نیت جو عبادات میں لازم ہوگئی، اب اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر عمل کے ساتھ یہ تصور لازم ہوگیا کہ یہ عمل کس بنیاد پر ہے اور کس کے لئے ہے اور وہ عبادت نام اسی عمل کا ہے جس کے ساتھ یہ تصور کارفرما ہو۔ روزہ جس چیز کا نام ہے، وہ اسی تصور سے وابستہ ہے، نہیں تو وہ فاقہ ہے، روزہ نہیں ہے۔ حج جس کا نام ہے وہ وہی ہے جس میں یہ تصور ہو نہیں تو وہ سفر مکہ ہے، حج نہیں ہے۔ اسی طرح نماز اسی کا نام ہے جس میں یہ ہو، نہیں ہو تو اٹھا بیٹھی ہے، کچھ اذکار وافعال ہیں مگر نماز نہیں ہے۔ اس طرح تمام عبادات میں وہ نقطۂ مقصود بھی محفوظ ہو گیا جس کے لئے یہ عمل ہو رہا ہے۔

اب آپ میں سے جس سے بھی پوچھا جائے کہ نماز کیوں پڑھتے ہو؟ روزہ کیوں رکھتے ہو؟ حج کیوں کرتے ہو؟ وہ یہ نہیں کہے گا کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو یہی سب کرتے دیکھا ہے۔ یہ نہیں کہے گا کہ ہمارے خاندان میں یہی ہوتا چلا آیا ہے بلکہ یہ کہے گا کہ اللہ کا حکم ہے، اللہ کی رضا کے لئے ہم یہ کام کر رہے ہیں۔

یہ ہے نیت کے عبادات میں ہونے کا نتیجہ، یعنی فروع میں اصول کا تحفظ۔

عبادات کے خصوصی فوائد اور مشترک مفاد

عبادات میں جو دو حصے ہیں: ایک طریقۂ عبادت اور دوسرے مرکز عبادت کا تصور۔

ان عبادات کے فوائد و اسرار جو علیحٰدہ علیحٰدہ بتائے گئے ہیں۔ احادیث میں یا عقلی طور پر غور وتدبیر سے مختلف اشخاص ان فوائد پر تبصرہ کرتے ہیں، وہ زیادہ تر طریقۂ عبادت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان فوائد میں ہر عبادت اپنے الگ مصالح رکھتی ہے اور ایک کا فائدہ دوسرے سے حاصل نہیں ہوسکتا، مثلاً روزوں

کے لئے احادیث میں جو وارد ہے کہ اغنیاء کو فقراء کی بھوک کا احساس ہو، روز آخرت کی بھوک اور پیاس کا تصور پیدا ہو، قوت شہوانی کو شکست ہو وغیرہ وغیرہ۔ یا طبی حیثیت سے یہ خیال کہ معدہ جو مسلسل مصروف عمل رہتا ہے، اس کو ایک ماہ میں آرام دیا جائے یہ حفظان صحت کے لئے مفید صورت ہے۔

یا بعض لوگ معاشی نکتۂ نظر سے کہتے ہیں کہ ایک مہینہ انسان کو نصف راشن پر بسر کرنے کی مشق کرائی گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب مصالح روزہ کی نوعیت عمل سے متعلق ہیں یہ فائدہ نماز میں ڈھونڈھے نہیں جاسکتے، حج میں میں ڈھونڈھے نہیں جاسکتے، اور دوسری عبادتوں میں تلاش نہیں کئے جاسکتے۔

اسی طرح نماز میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس میں ایک بہت بڑی خاص جسمانی ورزش بھی انسان کی ہوتی ہے با نماز جماعت میں فوجی قواعد والا مفاد بھی پایا جاتا ہے۔ یہ باتیں طریقۂ عبادت سے متعلق ہیں اور نماز ہی سے تعلق رکھتی ہیں، روزہ میں یہ باتیں نہیں ہیں۔

اس طرح حج میں کوہ صفا و مروہ کے بیچ میں دوڑنا، وہ حالت احرام میں سر برہنہ رہنا وہ جامۂ احرام کی شکل میں امیر و غریب کا یکساں ہونا، ان سب سے انسان کی نخوت و غرور کو شکست ہوتی ہے اور تذلل پیدا ہوتا ہے۔ یہ مفاد حج کے اس طریقۂ خاص کے متعلق ہیں، اس لئے دوسری عبادتوں میں اس کی تلاش درست نہیں ہے۔ مگر وہ مفاد عبادت کا جو مرکز عبادت کے تصور سے متعلق ہے وہ تمام عبادتوں میں مشترک اور وہ انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے جیسا کہ روزہ کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا:

یا ایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔

''اے صاحبان ایمان تم پر روضہ رکھنا فرض ہے جیسا کہ ان پر فرض کیا گیا تھا جو تمہارے پہلے تھے تا کہ تم متقی ہو جاؤ۔''

اور عام طور سے عبادت کی ہدایت کرتے ہوئے یہی ارشاد ہوا:

یا ایھا النّاس اعبدوا ربّکم الّذی خلقکم و الّذین من قبلکم لعلّکم تتّقون۔

''اے انسانو! عبادت کرو اپنے اس پروردگار کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور انھیں جو تمہارے پہلے تھے تا کہ تم میں تقویٰ کا جوہر پیدا ہو جائے۔''

تقویٰ کیا ہوتا ہے؟ ایک سانچہ جس میں ڈھل کر پوری زندگی پابند فرائض ہو جائے۔ یہ چیز اس عمل کے ساتھ جو تصور معبود ہے اس سے پیدا ہوتی ہے، جتنا یہ تصور قوی ہوگا، اتنا ہی یہ فائدہ مکمل طور پر حاصل ہوگا۔ اس طرح عمل تو ایک محدود وقت میں ختم ہو جائے گا مگر اثر اس کا دیرپا ہوگا جو مستقل طور پر انسان کو بے راہ روی سے روکے گا جیسا کہ نماز کے لئے ارشاد ہوا ''ان **الصلوۃ تنھی عن الفحشاء و المنکر**'' نماز بری باتوں اور شرمناک کاموں سے روکتی ہے۔

وہ فوائد کو طریقۂ عبادت سے متعلق ہے۔ اس نوعیت عبادت کے انجام دینے سے بہر حال حاصل ہوں گے خواہ نیت کوئی بھی ہو، لیکن وہ فائدہ جو مقصد عبادت کے تصور سے متعلق ہے وہ صحیح نیت سے وابستہ ہے اور جب تک نیت درست نہ ہوگی ہزار نمازیں، ہزار روزے، ہزار حج بھی اس جوہر کو حاصل نہیں کر سکتے جس کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

بے کار بہر حال نہیں

مذکورہ بالا بیان سے ایک غلط فہمی کا دفیعہ ہو جانا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ بعض لوگ ایسا سوچتے یا کہتے ہیں کہ جب ہماری نماز اس لائق نہیں کہ قبول ہو تو پھر ایسی نماز سے فائدہ کیا؟

ایک مفکر تو ایسے ہیں جنہیں نماز کی اہمیت و عظمت کے احساس ہی نے تارک الصلوۃ بنا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے ہم نفس کو اس قابل بنائیں کہ جیسی نماز ہونا چاہئے ویسی پڑھ سکیں، پھر نماز پڑھیں گے۔ یہ بھی گمراہی کا ایک راستہ ہے۔ اسی رخ

سے بعض لوگ عزاداری پر معترض ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اب عزاداری رسم ہو کر رہ گئی ہے اس میں وہ روح باقی نہیں ان مقاصد کی تکمیل نہیں ہوتی جو ان سے وابستہ ہیں۔

اس طریقہ پر سوچنے والے جس نتیجہ تک پہنچتے ہیں وہ درست نہیں ہے۔ یہ بات بحیثیت واقعہ مان لی جائے کہ نمازوں میں وہ حقیقت کارفرما نہیں ہے، اس حج میں موجود نہیں ہے اور اس عزاداری میں وہ جوہر باقی نہیں ہے، پھر بھی اس کے بعد بس ہمارا اور ہر ایک کا فرض یہی ہے کہ وہ اس کمی کو دور کرے یعنی کوشش کرے کہ نماز میں وہ بات پیدا ہو جائے، روزوں میں وہ جوہر حاصل ہو جائے، عزاداری میں ان خصوصیات کی تکمیل ہو جائے۔ مگر یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ کہ جب تک وہ نہ ہو، اس وقت تک یہ جو ہو رہا ہے یہ بھی ترک کیا جائے یا یہ کہ یہ سب بیکار ہے۔ بیکار پھر بھی نہیں ہے۔ نماز میں وہ جوہر جو بس ”ان الصلوٰۃ تنھا عن الفحشاء والمنکر“ کا معیار ہے، نہیں بھی ہے تو اس ظاہری نماز کے جو لازمی فوائد ہیں، وہ تو حاصل ہی ہوں گے۔ اسی طرح عزاداری سے جو صحیح تربیت نفس ہونا چاہئے وہ بھی نہیں ہوتی تو اس شعار کے قیام سے ہماری حیات ملی کا جو ظہور استحکام ہو رہا ہے، وہ کوئی معمولی مقصد نہیں ہے۔ اس لئے یہ سب چیزیں قائم رہنا چاہئے اور جو ان میں کمی ہے وہ دور کرنے کی کوششیں کرنا چاہئے، نہ یہ کہ بیکار کہہ کر ان چیزوں کو ہی ختم کرنے کا رجحان ظاہر کیا جائے جس میں یقیناً خسارہ ہوگا اور یقیناً بہت بڑا خسارہ ہوگا۔

تمام عبادات میں نماز کی خصوصیت

تمام عبادات میں نماز کو ایک خاص خصوصیت حاصل ہے۔ حالانکہ دوسری عبادتوں میں مشقت اکثر نماز سے زیادہ ہے۔ روزہ میں اور بالخصوص گرمیوں کے زمانے میں، وہ دن بھر کی بھوک پیاس۔ حج میں وہ ترک وطن، وہ لو دھوپ میں عرفات کا وقوف، وہ صفا و مروہ کے درمیان کی دوڑ، وہ احرام کی پابندیاں اور جہاز میں تو جان کا خطرہ مگر پھر بھی نماز کی اہمیت سب سے زیادہ بتائی گئی ”یہ قبول تو سب قبول اور یہ رد تو سب رد“

”الصلوۃ عمود الدین“ نماز وہ ستون ہے جس پر دین کی پوری عمارت قائم ہے۔

ہر عبادت کسی موقع پر ساقط ہو جاتی ہے مگر نماز یہ چھت کے نیچے دبے ہونے کی حالت میں بھی، آگ کے شعلوں کے اندر بھی، موجوں کے تھپیڑوں کے اندر حیات و موت کی کشاکش کے درمیان، غرض ہر حال میں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ صورت شکل مختلف حالات میں بدل جائے اور رکوع و سجود کے طریقہ مختلف ہو جائیں۔ آخر نماز کی اہمیت تمام عبادات میں سب سے زیادہ کس لئے ہے؟

وہ سب سے بڑی خصوصیت ایک ہے وہ یہ کہ دوسری عبادتوں میں مرکز عبادت کا تصور بس نیت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے لیکن اصل عبادت خاموش ہے، بے زبان ہے وہ اپنے مقصد کے اظہار میں گنگ ہے۔

دن بھر آپ نے روزہ رکھا یعنی تمام مفطرات کو چھوڑے رہے مگر یہ مفطرات کا چھوڑنا ایک سادہ صفحہ ہے جس میں دیکھنے والے کو یہ لکھا دکھائی نہیں دے سکتا کہ یہ کس کی خاطر ہے؟

حج میں خانہ کعبہ کے گرد چکر لگا رہے ہیں، صفا و مروہ کے درمیان دوڑ رہے ہیں، مگر یہ سب خاموش افعال ہیں۔ وہ خود یہ پکار کر کہتے نہیں کہ یہ کس کے لئے ہیں؟ ایسے ہی تمام عبادات۔

مگر نماز، اس میں اگر فقط افعال یعنی قیام، رکوع، سجود کے حرکات ہوتے تو اس کی بھی حیثیت وہی ہو جاتی جو تمام عبادات کی ہے مگر اس میں لازمی طور پر اذکار کی شرکت نے اس عبادت کو ناطق بنا دیا ہے اور خود طریقۂ عبادت مقصد عبادت کا حامل ہو گیا ہے۔ جو کام دوسری عبادتوں میں صرف نیت سے ہوتا تھا وہ کام یہاں خود عمل کا ہر جز و بھی کر رہا ہے۔

بیشک حج میں بھی عقد احرام کے وقت تلبیہ ضروری جز و ہے اور وہ وہاں مرکز عبادت کا اعلان کر دیتا ہے مگر وہ ابتدائے عمل کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے، آخری منزلوں میں ساتھ ساتھ نہیں

چلتا۔ مگر نماز میں تو جس وقت سے اللہ اکبر کہا اس وقت سے آخر وقت تک ہر ہر قدم پر اس کا اعلان ہوتا ہے کہ یہ عمل کس کی خاطر ہے اور اس سے مقصود کیا ہے؟

یہ خصوصیت نماز کی وہ ہے جو تمام عبادات میں اسے ممتاز بنا دیتی ہے بیشک شریعت کے حکیمانہ نظام نے دوسرے عبادات میں اس کمی کو ان اوراد و اذکار سے پورا کیا ہے جن کی بطور استحباب مختلف حالات میں تعلیم دی ہے۔ جیسے روزہ میں سحر اور مختلف اوقات کی دعائیں اور حج کے مختلف افعال میں دعائیں یہاں تک کہ وضوء کے ہر جزو کے ساتھ ایک الگ دعا۔ مگر یہ چیز چونکہ جزو عبادت نہیں ہے اور اختیاری حیثیت رکھتی ہے، اس لئے نفس عبادت پھر بھی نماز کی ہم پلہ قرار نہ پائے گی اور نماز کو جو اہمیت حاصل ہوئی وہ دوسری عبادتوں کو حاصل نہیں ہوئی۔

دوسری بعض عبادتوں کے خصوصی امتیازات

جس طرح نماز کے طریقۂ عبادت میں یہ بڑی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے مقصد کی خود ترجمان ہے، اسی طرح دوسری عبادتوں میں بھی بعض امتیازی خصوصیات ہیں، مثلاً روزہ، اس کی ایک بڑی اہم خصوصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر دوسری عبادت میں ریاء وسمعہ کا گذر ہے مگر روزہ میں ان دونوں چیزوں کا گذر نہیں ہے۔ سمعہ کیا ہے؟ کسی عمل کو دوسروں کو سنانے کے لئے کرنا اور ریا کیا ہے دوسروں کو دکھانے کے لئے کرنا یہ دونوں باتیں مقبولیت عمل کی دشمن ہیں۔ روزہ کے علاوہ جتنے عبادات ہیں، ان میں اذکار ہیں اور افعال ہیں۔ اذکار قوت سامعہ سے متعلق چیز ہیں۔ اس لئے ان میں سنانے کا مقصد ہوسکتا ہے۔ مثلاً تنہائی میں میں نے نماز پڑھی تو رواروی کے ساتھ پڑھی، مگر بقدر واجب مخارج حروف کے لحاظ سے ادا کردی اور جب کسی مجمع میں نماز پڑھی تو اب ادائے حروف کی طرف توجہ زیادہ ہوگئی یا تنہائی میں تلاوت قرآن معمولی طریقہ پر ہوجاتی تھی اور اب ان لوگوں کے کے سامنے بڑی ترتیل کے ساتھ ہو رہی ہے۔

اور افعال، ان میں دکھانے کا مقصد شریک ہوسکتا ہے جیسے نماز یں ایک درجہ طمانیت کا تو صحت نماز کے لئے ضروری ہے اور ایک درجہ خضوع وخشوع کا ہے جس سے فضیلت وکمال نماز وابستہ ہے۔

اگر میں جب بطور خود نماز پڑھوں تو بس ادنی درجہ طمانیت کو ملحوظ رکھوں لیکن اگر لوگوں کے سامنے نماز پڑھوں تو بڑے خضوع وخشوع کے ساتھ تاکہ لوگ سمجھیں کہ میں کتنا اللہ والا ہوں تو بس یہ غضب ہے۔ اب شاید وہی گھٹیا درجہ کی نماز جو میں روز پڑھتا تھا میرے کام آئے مگر یہ اعلیٰ درجہ کی نماز کو اپنے خیال میں میں نے ادا کی، پیش خدا مقبول نہ ہوگی۔ یہ وہاں سے رد ہوجائے گی اور کسی کام نہ آئے گی۔

ہر عبادت میں یہی صورت ہے مگر روزہ، یہاں نہ ذکر ہے جو سنانے کی چیز ہو، نہ کوئی حرکت وعمل ہے جو دکھانے کی چیز ہو، یہاں تک تو بس ترک ہے اور ترک عدم کے قبیل سے ہے جو نہ سنائی دیتا ہے، نہ دکھائی دیتا ہے۔

دکھلانے کے لئے تو روزہ کی ضرورت نہ تھی، روزہ دار کی صورت کافی تھی، اب جو روزہ رکھا ہے اور واقعی رکھا ہے تو لازماً کسی کے سنانے یا دکھانے کو نہیں ہے۔ وہ اسی کے لئے ہوسکتا ہے جو نادیدنی چیزوں کو بھی دیکھنے والا ہے۔ اور وہ صرف خداوند عالم ہے اسی لئے حدیث قدسی میں ہے کہ "**الصوم لی وانا اجزی به**"۔ روزہ میرے لئے ہوتا ہے اور میں اس کی جزا دینے والا ہوں۔

اب اس جزا کی قدر و قیمت کیا بیان ہوسکتی ہے جسے بایں جلال و جبروت وہ خود اپنی ذات کی طرف خصوصی حیثیت سے منسوب کرے اور اسی لئے وہ متبرک مہینہ رمضان کا جو اس عبادت کا اصل محل ہے، اللہ کا مہینہ قرار پایا اور وہ سطحی نظر والوں کی عید ہے جسے عید کہتے ہیں اور یہ اولیاء الٰہی کی عید ہے جو عید کے آنے سے رخصت ہوتی ہے۔ اسی لئے امام زین العابدین نے دعائے وداع میں یہ الفاظ فرمائے ہیں:

"**السلام علیک یا عید اولیاء اللہ الاعظم**" سلام ہو

تجھ پرائے اولیاء الٰہی کی سب سے بڑی عید۔

عبودیت میں راز حریت

عبادت کیا ہے؟ عبودیت کا مظاہرہ، کس کی عبودیت؟ خالق کائنات کی۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کسی نہ کسی کے سامنے جھکتا ہی ہے۔ جس سے اپنی حاجتوں کو وابستہ دیکھے جس سے اپنے نقصان کا اندیشہ محسوس کرے۔ جسے اپنے سے بالا تر سمجھے۔ بچپن میں اپنے ماں باپ کو اپنا مرکز حاجات جانا تو ان کے سامنے جھکا۔ بڑا ہوا، دولت کا خواہش مند ہوا تو جس رئیس اور امیر کبیر کو مرکز دولت سمجھا اس کے سامنے جھکا۔ علم کا طلبگار رہا تو جس استاد کو مرکز افادہ خیال کیا اس کے سامنے جھکا یہاں تک کہ اگر کسی سیاسی حلقۂ خیال کا جزو ہے کسی ازم کا پیرو ہے تو اس ازم کے جو مؤسسین یا بڑے مبلغین ہیں ان کی تصویروں کو ہار پہنائے، انھیں مرکز عقیدت بنایا اور ان کے سامنے جھکا۔ غرض کتنا ہی بخیال خود باغی قسم کا آدمی ہو، یہ بغاوت اس کی اضافی ہوگی یعنی جسے دوسرے لوگ مان رہے ہیں۔ ممکن ہے ان کے مقابلہ میں یہ بغاوت ہو مگر اس کے کچھ ذہنی معبود ضرور ہیں جنھیں یہ مانتا ہے اور جن کے آگے یہ سر جھکاتا ہے۔

مگر یہ انسان بطور خود جدھر بھی جھکتا ہے وہ خود ناقص ہیں اور ان کے سامنے جھکنے سے انسان بھی بہت سے پست مقاصد پر اپنی فطری بلندیوں کو نچھاور کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسلام نے یہ کام کیا کہ اس عبودیت کو جس میں ہر حال میں انسان کو گرفتار رہنا تھا، ایک بلند ترین مرکز سے وابستہ کر دیا جس کی وجہ سے یہ ان ناقص مجسموں کی بندگی سے آزاد ہو گیا۔

اس طرح حقیقت میں یہ عبادت و بندگی کا پیغام کوئی غلامی نہیں بلکہ ان غلامیوں سے آزادی کا پیغام ہے جس میں یہ مبتلا ہوسکتا تھا اور یقینا مبتلا ہوتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں کہا گیا تھا "العبودیة جوهرة كنهها الربوبية" عبودیت ایک جوہر ہے جس کی اصل حقیقت ربوبیت ہے یعنی دنیا کی ہر قید سے آزادی۔

اللہ کا ایک صحیح بندہ طمع کی زنجیروں میں گرفتار نہیں ہوتا۔ خوف کی بیڑیوں میں مقید نہیں ہوتا۔ کھینچی ہوئی تلوار کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔ کسی قہار لشکر سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں بیڑیاں بھی پہنائی جاتی ہیں تو اس کا جسم مقید ہوتا ہے مگر وہ خود آزاد رہتا ہے شہنشاہیتوں کے شکنجۂ اقتدار میں اس کی زندگی بسر ہوتی ہے مگر کوئی بڑی سے بڑی طاقت اس کے ضمیر کو خرید نہیں سکتی۔ یہ ہے اللہ کا بندہ اور یہ ہے اسکی عبادت اور عبودیت کا ثمرہ جو اس کی زندگی میں نمودار ہوتا ہے۔

عبادت کا مطالبۂ لازوال

عبادت عبودیت کا تقاضا ہے اور عبودیت خالق کی ربوبیت کی بنا پر ہے۔ اس کی ربوبیت کبھی ختم ہونے والی نہیں تو ہماری عبودیت بھی دائمی چیز ہے اور اس لئے عبادت کا بھی مطالبہ لازوال ہے، نہ کوئی اس کی مدت ہے، نہ کوئی اس کی حد۔ اس لئے قرآن مجید میں ہے کہ **"واعبد ربک حتیٰ یاتیک الیقین"** اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آخر دم تک اللہ کی عبادت کرو۔ مگر کیا کہا جائے کہ شیطانی وساوس ہر چیز میں گمراہی کے پہلو پیدا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک طبقہ نے اس کے معنی یہ قرار دئے کہ اللہ کی عبادت کرو اس وقت تک جب تک یقین کی منزل تک نہ پہنچو۔ یعنی جب اس درجہ پر پہنچ جاؤ جو یقین کا ہے اور یہ تصوف کے منزل میں ترقی کے ساتھ ایک خاص مرتبۂ معرفت ہے تو بس پھر عبادت کا فریضہ ختم ہے۔ اب نماز روزہ وغیرہ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ درحقیقت یقین کی لفظ لغت سے دیکھ کر حل کرنے کا نتیجہ ہے لیکن خود قرآنی اصطلاح اگر سامنے رہے تو یہ تصویر غلط ثابت ہو۔ ملاحظہ ہو، بالکل ایسا ہی جملہ قرآن مجید میں دوسری جگہ اہل جہنم کے لئے آیا ہے۔ انتیسواں پارہ سورۂ مدثر:

"فی جَنّٰتٍ یتسآءلون۔ عن المجرمین۔ ما سلککم فی سقر۔ قالوا لم نک من المصلین۔ ولم نک نطعم المسکین۔ وکنا نخوض مع الخآئضین۔ وکنا نکذب

بیوم الدین۔ حتیٰ آتنا الیقین۔ فما تنفعھم شفاعۃ الشافعین۔"

"مجرموں سے آپس کی گفتگو میں پوچھا جا رہا ہوگا کہ آخر تمہیں دوزخ میں کون سی بات لے گئی تو ان لوگوں نے کہا ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، ہم غریبوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔"

یہ انسانی کردار کی تاریکی کے مختلف رخ ہیں یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص میں یہ صفات جمع ہی ہوتے تھے بلکہ کسی میں حقوق اللہ کی ادائیگی کی کمی تھی کسی میں حقوق الناس کی۔

"و کنا نخوض مع الخائضین" اور ہمیں اور شورشوں میں فسادوں میں ہنگاموں میں شریک ہونے کا شوق تھا۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ ہنگامہ حق بجانب ہے یا غلط ہے مگر کچھ انسانوں کا ذوق یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر شور کرنے والے کے ساتھ شور کرنے لگیں اور ہر اچھل کود مچانے والے کے ساتھ اچھلنے کودنے لگیں۔

"و کنا نکذب بیوم الدین" اور ہم روز جزا کو جھٹلاتے رہتے تھے۔ یہ جھٹلانا زبان ہی سے نہیں ہوتا بلکہ بہت سے اشخاص کا خود کردار پتہ دیتا ہے کہ انھیں آخرت کا تصور نہیں ہے۔ یہ سب وہ باتیں تھیں جو جہنم میں لے گئی ہیں اور اب یہ فقرہ ہے کہ "حتیٰ اتنا الیقین" یہ سب اس وقت تک رہا جب تک ہمارے پاس یقین آیا۔

"یہ حتیٰ اتانا الیقین" فعل لازم اور صیغۂ متکلم کے ساتھ وہی جملہ ہے جو وہاں مضارع اور صیغۂ مخاطب کے ساتھ "حتی یاتیک الیقین" ہے۔

تو اب دیکھئے کہ اہل دوزخ جو یہ کہہ رہے ہیں "اتنا الیقین" اس کے معنی کیا ہے کیا یہ یقین وہ کمال معرفت کا درجہ ہے جو مخصوص اولیاء الٰہی کا حصہ ہے؟ حاشا و کلا۔

یقین کے معنی ہیں موت یعنی یہ ہماری حالت آخر دم تک رہی جب تک کہ ہمیں موت آئی تو اب اسی سے "حتیٰ یاتیک الیقین" کے معنی سمجھ لیجئے کہ آخر نفس تک یعنی جب تک موت جسم و روح میں تفرقہ نہ کرے برابر اللہ کی عبادت کرتے رہو۔

تصور ربوبیت کی اہمیت

قرآن مجید میں عبادت کا حکم دینے میں اکثر اللہ اسم ذات یا دیگر صفات حسنیٰ کو سرنامہ حکم قرار دینے کے بجائے "رب" کی لفظ کو سرنامہ قرار دیا ہے جیسے: یاایھا الناس اعبدوا ربکم۔ بات یہ ہے کہ اللہ تمام صفات کمال جلال و جمال پر حاوی ہے اور اسی لئے اسے اسم ذات کہتے ہیں اور تمام اسماء سے یہ اسم اجل و اعظم ہے مگر خود اس لفظ سے وہ رابطہ اس کا جو ہم سے ہے ظاہر نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس کے اور بہت سے صفات جیسے العظیم، العلی، ذوالجلال والاکرام، القدوس وغیرہ وغیرہ۔

بیشک خالق اور اس کے مفہوم کو ادا کرنے والے الفاظ جیسے الباری، المصور وغیرہ ہم سے ربط کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر خلق کیا کیا ہے؟ کتم عدم سے حیز وجود میں لانا۔ یہ یہ نسبت ہمارے ایک احسان ماضی کا تذکرہ ہے کہ تم ایک وقت میں "نیست" تھے اللہ نے تم کو "ہست" کیا۔ یہ بھی بیشک ہم پر عقلی حیثیت سے اس کے ادائے حق کو فرض قرار دیتا ہے مگر انسانی ذہن کو ماضی کا ذکر اتنا متاثر نہیں بناتا جتنا حال کا تذکرہ۔ یہ ربوبیت کی یاد دلانے میں مضمر ہے۔

رب کون ہے؟ پرورش کرنے والا، پالنے والا، یہ کوئی تاریخ ماضی کے دہرانے کی بات نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کے ہر لمحہ میں جو اس کی طرف سے رزق مل رہا ہے تمام کائنات کے عناصر جو اس کی ضروریات کو پورا کرنے میں مصروف ہیں یعنی

ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ درکار اند
تا توانے بکف آری و بغفلت نخوری

یہ پوری تفصیل رب کے جمال میں مضمر ہے۔

نصاریٰ اور مسلمانوں کی اصطلاح میں جو فرق ہے وہ یہی ہے۔ نصاریٰ اسے رب یعنی باپ کہتے ہیں اور اسلام اسے رب یعنی پروردگار کہتا ہے اب رب کی لفظ صرف سبب وجود ہونے پر ناظر ہے۔ اس لئے کہ باپ اس کے وجود میں لانے کا باعث ہوتا ہے مگر سبب بقا نہیں ہوتا۔ اکثر باپ دنیا سے اٹھ گیا ہے اور پھر بچہ

پیدا ہوتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔

مگر رب یعنی پالنے والا، یہ اسباب بقا کا تصور پیدا کرتا ہے کہ اگر ایک لمحہ کے لئے اس کی نظر عنایت ہٹ جائے تو انسان نیست و نابود ہو جائے اس میں عبادت کی جتنی تحریک ہے اتنی صرف خالق ہونے کے احساس میں نہیں ہے۔ اس لئے کہ قرآن میں عبادت کا حکم دینے میں زیادہ اس کو ''رب'' کے لفظ کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔

عبادت کا وسیع مفہوم

عبادت کی لفظ کا جب اطلاق کیا جاتا ہے تو اکثر کچھ خاص قسم کی باتیں اس سے ذہن میں آتی ہیں اور انھیں کا بیان ہوتا ہے جیسے نماز، روزہ اور حج وغیرہ جو فرض ہیں، یا مستحبی عبادات جیسے تلاوت قرآن، نماز ہائے مستحبی اور زیارت وغیرہ۔

ہم نے ابھی تک عبادات کے تحت میں ان چیزوں کا ذکر کیا اور ان پر روشنی ڈالی۔ دوسری طرف ہم یہ کہتے ہیں کہ اور حقیقت ہے کہ عبادت کا مفہوم اسلام میں بہت وسیع ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ کے ضروریات کو پورا کرنا عبادت ہے چونکہ قانون الٰہی انسان کی انفرادی اور اجتماعی پوری زندگی کو شامل ہے اس لئے اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، احباب سے ملنا، عزیزوں سے سلوک کرنا، اولاد کے ساتھ پیار اور محبت کرنا یہاں تک کہ وہ چیزیں جنھیں حیوانی خواہشات کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے وہ سب اسلام میں عبادت کا درجہ رکھتی ہیں۔

چونکہ اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں جس کے معنی صرف کچھ معتقدات اور کچھ خاص اوقات میں کچھ خاص رسموں کے ادا کرنے کے ہوں، بلکہ یہ ایک مکمل دین ہے جو انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے اور یہاں دین دنیا سے الگ نہیں ہے اس لئے کہ کوئی جز انسان کی زندگی کا نہیں، چاہے وہ اپنے ذات کے بارے میں ہو یا اہل و عیال کے بارے میں یا اہل محلہ کے بارے میں یا اہل شہر کے بارے میں، جو قانون الٰہی کے حدود سے خارج ہو۔ اس لئے یہ تمام چیزیں عبادت میں داخل ہیں۔

بظاہر یہ دونوں باتیں متضاد نظر آتی ہیں یعنی یہ کہ نماز و روزہ وغیرہ کو خصوصیت کے ساتھ عبادت کہنا اور پھر عبادت کو اتنا ہمہ گیر اور وسیع بھی ماننا۔

اگر عبادت کا زندگی کے ہر کام پر اطلاق ہے تو نماز روزہ وغیرہ ہی کو عبادت کیوں سمجھا جائے۔ اور اگر عبادتیں یہ گنتی کی چیزیں ہیں تو یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ہر کام جو کسی ضرورت یا مفاد زندگی کی تکمیل کرے وہ عبادت ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے بہت سی لفظیں ایسی ہوتی ہیں جن کے دو معنی ہوتے ہیں۔ اسی طرح عبادت کی لفظ کے دو معنیٰ ہیں ایک خاص اور ایک عام۔ ایک معنیٰ کے لحاظ سے نماز اور روزہ وغیرہ کو عبادت کہا جاتا ہے اور دوسرے معنیٰ کے لحاظ سے اسے جامع اور ہمہ گیر کہا جاتا ہے۔

عبادت مفہوم خاص کے لحاظ سے ان خاص اجزائے ترکیبی سے ترتیب یافتہ اعمال کا نام ہے جن کی ساخت ہی صرف بارگاہ الٰہی میں نیازمندی کے مظاہرے کے لئے ہوئی ہے اور اس لئے وہ عمل اس وقت تک عمل ہی نہیں ہے جب تک کہ اس میں قصد تقرب یعنی رضائے الٰہی کی نیت نہ ہو۔

یہ ہیں نماز، روزہ حج وغیرہ اسی طرح مستحبی عبادتیں جیسے نماز نافلہ وغیرہ وہ مستحب ہیں۔ بایں معنیٰ کہ انسان اسے پڑھے ہی نہیں تو کوئی جرم نہ ہوگا۔ لیکن اگر پڑھے تو اسے رضائے الٰہی ہی کے لئے پڑھے جب تک کہ اس قصد سے نہیں پڑھے گا وہ امر انجام نہیں پائے گا جس کا حکم تھا لیکن مفہوم عام کے لحاظ سے جو ہم کہتے ہیں کہ اسلام میں عبادت تمام زندگی کے شعبوں پر حاوی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت مقدسہ کے قوانین چونکہ ہماری تمام زندگی کو گھیرے ہوئے ہیں، اس لئے ہر عمل جو اس کے قانون کے مطابق ہے اگر انسان اس میں یہ قصد کر لے کہ ہم اس خالق کی رضا کے لئے انجام دے رہے ہیں تو وہ ہر عمل بطور عبادت وقوع میں آئے گا۔ مثلاً جامع الفاظ میں خود ہمارا زندہ رہنا

(بقیہ۔۔۔۔۔۔۔) صفحہ ۱۵ / پر

سرکاردوعالم کا حجرہ ہے اور وہی حضورؐ کا مدفنِ مبارک ہے۔ اس کے قریب ہی حضرت فاطمہ زہراعلیہا السلام کے گھر کی وہ جگہ ہے جہاں آپ کا اور امیر المومنین حضرت علیؑ کا قیام تھا اور بعض روایتوں کی بنا پر اسی جگہ پارۂ جگر رسولؐ حضرت سیدۂ عالمؑ کی قبر مطہر ہے۔ حجرۂ نبوی کی ابتدائی تعمیر اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کرائی تھی۔

چونکہ امیر المومنین حضرت علیؑ نے قبر سیدۂ عالم کو پوشیدہ کردیا تھا اس لئے اس کا احتمال ہے کہ آپ کی قبر مطہر مسجد نبوی کے احاطہ میں ہو یعنی منبر وقبرانور سرکاردوعالم کے درمیان۔ جس کے لئے حضور اکرمؐ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے: "مَا بَیْنَ بَیْتِیْ وَمِنْبَرِی رَوْضَۃٌ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ" میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا پھر حضورؐانور کے پائنتی جہاں بیت سیدۂ عالمؑ واقع تھا جس طرح انس کا بھی احتمال ہے کہ آپ کی قبر مبارک جنت البقیع میں ہو اور اسی بنا پر ان تمام مقامات پر حضرت سیدۂ عالمؑ کی زیارت پڑھی جاتی ہے۔

٭٭٭

بقیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔عبادت اور طریق عبادت

جب تک کہ اس کی طرف سے موت کا فیصلہ نہ ہوا سے مطلوب ہے۔ اگر یہ مطلوب نہ ہوتا تو خودکشی گناہ نہ ہوتی۔

اب جب کہ ہماری زندگی اسے مطلوب ہے تو جتنے ہمارے ضروریات حیات ہیں وہ سب اس کے منشاء کی تکمیل ہیں لہٰذا اگر ہم کھانا کھائیں اور اس لحاظ کے ساتھ کھائیں کہ خالق کو مطلوب ہے تو یہ کھانا کھانا عبادت ہوگا۔ پانی پئیں اس قصد سے تو یہ پانی پینا عبادت ہوگا۔ سوئیں اس مقصد سے تو یہ سونا عبادت ہوگا۔ غرض جتنے بھی کام ہیں سب اس قصد سے کریں تو وہ عبادت ہوں گے لیکن اگر ہم کھانا کھاتے ہیں پانی پیتے ہیں سب ضروریات حیات پورے کرتے ہیں تو جو خالق کا منشاء ہے وہ پورا تو رہا ہے اس لئے ہم خودکشی کے گناہ کے مرتکب نہیں ہیں مگر ہمارے یہ اعمال عبادت نہیں ہوں گے بلکہ ہمارا خیال اس سے کسی گناہ کا ہو گیا ہے تو وہ ایک طرح کی معصیت ہو جائے گی۔

ہمارا حفظان صحت خالق کو مدنظر ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو خوف ضرر کی صورت میں وضو وغسل کو تیمم سے کیوں تبدیل کیا جاتا اور روزہ کے ترک کا حکم کیوں ہوتا لہٰذا ہم اگر حفظان صحت کے لئے ورزش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ قصد ہے کہ جو ہمارے خالق کو پسند ہے تو یہ ورزش ہماری عبادت ہو جائے گی اور اگر یہ قصد نہیں ہے وہ امر تو حاصل ہو جائے گا جو منظور خالق ہے مگر عبادت کے طور پر نہ ہوگا، اس طرح بفیض نیت خالص حیوانی خواہش کی تکمیل والے کام بھی عبادت بن جائیں گے اس لئے کہ بقائے نظام نوعی کے لئے اگر جنسی تعلقات اسے مطلوب نہ ہوتے تو رہبانیت شریعت اسلام میں مذموم کیوں ہوتی لہٰذا اگر جائز ذرائع سے ان تعلقات کے قیام کے وقت مقصد الٰہی پیش نظر ہے تو وہ لذت اندوزی بھی عبادت ہوگی۔ اسی طرح اولاد کے ساتھ پیار، عزیزوں کے ساتھ محبت، سامانِ آرائش وتزئین وغیرہ سب باتیں جو دنیاداری کی ہیں، مقصد کے صحیح ہونے سے داخل عبادت ہو سکتی ہیں۔ یونہی تجارت، زراعت، صنعت وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اگر یہ قصد نہیں ہے تو وہ مقصد پورے ہوتے رہیں گے لیکن عبادت وقوع میں نہ آئے گی۔

اس طرح ہوسکتا ہے کہ ایک انسان کا ہر لمحۂ حیات عبادت بن جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر لمحہ معصیت ہو جائے اور ممکن ہے کہ انسان کے پیش نظر کوئی مقصد غلط نہ ہو اور اس طرح یہ افعال بطور جائز انجام پا جائیں لیکن رضائے الٰہی کے پیش نظر نہ ہونے سے انہیں عبادت کا درجہ حاصل نہ ہو۔

